

نے ان کو متعدد خطوط میں حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کی ہدایت فرمائی، اس کی وجہ حضرت مفتی صاحب کی جلالتِ شان کے ماسوا سلسلہ طریقت کا اشتراک اور مناسبت بھی تھی، والد ماجد نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”نزہۃ الخواطر“ کی (جو آٹھ جلدوں میں عربی میں غیر منقسم ہندوستان کے ہزار بارہ سو سال کے اسلامی دور کے مشاہیر ہند اور ممتاز شخصیتوں کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل ہے) آٹھویں جلد میں حضرت مفتی صاحب کا بلند الفاظ میں قدسے شرح و بسط کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ مجھے حضرت مفتی صاحب کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا، کہ ۱۳۲۷ھ میں آپ کی وفات ہو گئی، اور میں دیوبند ۳۱/۹/۱۳۵۷ھ (۱۳۵۷ھ) میں حاضر ہوا، اور مولانا مدنی رحمۃ اللہ کے درس حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل کی، دیوبند کے ایک سفر کے موقع پر مفتی صاحب کے عم محترم مولانا بشیر احمد صاحب عثمانی دیوبند ہی تشریف رکھتے تھے، مولانا مدنی کے دولت کدہ پران سے نیاز حاصل ہوا، پھر کئی بار دولت خانہ پر بھی حاضر ہوا، مولانا کے ان حواشی کے بارے میں جو حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن پران کے قلم سے ہیں، میں نے اپنے تاثرات اور بحیثیت مدرس تفسیر کے اپنے تجربہ کا اظہار کیا۔ اور ان کی افادیت اور علمی و تحقیقی امتیاز کے بارے میں اظہار خیال کیا، تو مولانا کی خصوصی توجہ ہوئی اور خصوصی شفقت فرمانے لگے، اس وقت تک جہاں تک یاد ہے مفتی عتیق الرحمن صاحب سے ملاقات اور تعارف کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

مفتی صاحب کے نیاز اور براہ راست ملاقات کا سلسلہ (جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے) ۱۹۴۷ء کے بعد سے شروع ہوا، جب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ کی خدمت میں پہلی بار حاضری ہوئی اور پھر مستقل ربط قائم ہو جانے کی بنا پر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مدلی کا سفر پیش آتا رہا اس وقت تک مدلی کے نامور اور ممتاز علماء اور علمی اشتغال اور سیاسی ذوق رکھنے والے فضلا (حضرت مفتی کفایت اللہ

صاحب کو مستثنیٰ کر کے) مولانا سے زیادہ متعارف و مانوس نہیں تھے۔ اور ان کی نظام الدین کے تبلیغی مرکز میں آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی، میں اپنی بے بضاعتی اور کم مانگی کے باوجود دارالعلوم ندوۃ العلماء سے درس و تدریس کا انتساب رکھنے اور کچھ لکھنے پڑھنے کی مناسبت سے دہلی کے ان علماء اور مولانا کے درمیان رابطہ بننے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس وقت جامع مسجد پر مولانا سید محمد صاحب حرم کا مکتبہ عزیزیہ باذوق و سنجیدہ علماء اور علمی و سیاسی ذوق رکھنے والے احباب کی (جن کا زیادہ تر جمعیۃ العلماء سے تعلق تھا) نشست گاہ اور بزم احباب تھی، مولوی سید محمد صاحب کے اخلاق، خوش گفتاری اور زندہ دلی کی وجہ سے میری بھی آمد و رفت شروع ہوئی، وہاں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی بھی تشریف لایا کرتے تھے، میں نے دونوں کو نظام الدین آنے کی دعوت دی، اور دونوں حضرات میری دعوت پر وہاں تشریف لائے، میں نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مفتی صاحب کے بارے میں بلند الفاظ سنے تھے، فرماتے تھے کہ ”حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب کو مفتی عتیق الرحمن صاحب کی فقہی صلاحیت اور نظر پر بڑا اعتماد تھا، اور وہ ان کے فقہی جوابات سے مطمئن ہوتے تھے، مجھے ان کا فقہ و افتاء کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہونا، اچھا نہیں معلوم ہوتا، کہ ان کو اس فن سے خصوصی مناسبت اور امتیاز حاصل ہے۔“

مفتی صاحب سے اصل ربط و تعلق ۱۹۴۴ء سے شروع ہوا، اس وقت ندوۃ المصنفین،، قرد بلاغ دہلی میں تھی، حسن اتفاق کہ اس زمانہ میں اس کے مرکز کے قریب ہی میرے والد مرحوم کے ایک خلص دوست عم مخدوم و محترم الحاج سید محمد خلیل صاحب نہپوری مرحوم مقیم تھے، ان کے صاحبزادہ گرامی قدر برادر محترم سید محمد جمیل صاحب (جو بعد میں پورے پاکستان کے کانٹینینٹ جنرل ہوئے) ریلوے کے آڈیٹر تھے اور ایک زمانہ میں دہلی میں انکی پوشنگ تھی، اس تعلق و مناسبت سے میرا بار بار وہاں

آنا جانا ہوتا تھا، سید محمد خلیل صاحب اور سید محمد جمیل صاحب دونوں مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اور ندوۃ المصنفین سے ربط و تعلق رکھتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ جو حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ و مصنف ”اظہار الحق“ کے خاندان کے چشم و چراغ اور آثار رحمۃ اللہ میں سے تھے، بعض سیاسی حالات و مصالح کی بنا پر مکہ مکرمہ سے آکر قرولباغ دہلی میں اسی ماحول و بخوار میں جس کا تذکرہ کیا گیا مقیم تھے، یہیں سے وہ رسالہ ”ندائے حرم“ کی ادارت و اشاعت بھی فرماتے تھے۔ اور مدرسہ صولتیہ کی رہنمائی و نگرانی بھی، اتفاق سے انہیں دنوں ہمارے مخدوم مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی ایم۔ اے۔ علیگ بھی دہلی میں مقیم تھے اور ان کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا، وہ مجھ پر خاص کرم فرماتے تھے، اور مجھے بھی ان سے بڑی موانست و مناسبت تھی، میں قرولباغ جاتا تو آدھے آدھے دن رہ جاتا، علم و ادب، زندہ دلی اور مجلس آرائی، چشم و گوشت اور کام و دہن سب کی لذت سب کا سامان ایک جگہ ہم ہوتا مفتی صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب بھی شریک بزم ہوتے، انھوں نے کبھی اپنی قیام گاہ پر بلا کر کھانے کی ضیافت بھی فرمائی۔

اس کے بعد مفتی صاحب سے صرف اہم اجتماعات میں ملاقات ہوتی، مثلاً بمبئی کا علمی کنونشن جو مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ۱۹۵۵ء میں بلایا تھا، تقسیم ہند کے بعد جمعیتہ العلماء کا پہلا جلسہ جو ۱۳۶۶ھ (اپریل ۱۹۴۸ء) میں مولانا مدنیؒ کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اور اس کے اکثر مہمان دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم تھے نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا پاکستان میں حادثہ ارتحال پیش آیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہم نیاز مندوں نے مولانا کی یاد میں ۱۳۵۶ھ میں ایک سنجیدہ اور علمی اجتماع منعقد کیا، جس کی شرکت کے لئے ضعف و علالت کے باوجود مولانا سید

مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم اپنے وطن کھنؤ تشریف لائے مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب اپنی شرافت نفس، سید صاحب کے ساتھ تعلقات اور دارالمصنفین ندوۃ المصنفین کے علمی ورسمی رشتہ و اشتراک کی بنا پر کیسے شرکت نہ فرماتے؟ تشریف لائے اور بڑے ذوق و دل چسپی کے ساتھ پورے اجتماع میں شریک رہے، سید صاحب کا ہندوستان کو خیر باد کہہ کر پاکستان تشریف لے جانا اور وہیں قیام اختیار کر لینا ایک علمی ادبی اور ملی ساتھ تھا، لیکن حالات اور مجبوریوں اور خانگی نزاکتوں کی ”سنگین منطق“ میں خصل در معقولات، کی کیا گنجائش؟ مفتی صاحب نے اپنے ہی تاثر نہیں بلکہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ اور علمی و تصنیفی اداروں کی اس ملی علی حیرت و حسرت کو جس خوبی ذہانت و لطافت کے ساتھ اپنی تعزیتی تقریر میں ادا کیا وہ مفتی صاحب ہی کا حق تھا، اور ذوق و گوش ابھی تک اس کی لذت لے رہے ہیں، مفتی صاحب نے فرمایا کہ ہم عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کی تمنا تو یہ تھی کہ سید صاحب کی آخری آرام گاہ یا اپنے محبوب و محسن استاد و مرقی علامہ شبلی کے پہلو میں ہوتی، یا اپنے مرکز عقیدت شیخ و مرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پہلو میں، مگر تقدیر الہی کچھ اور تھی۔

من چُتال خواہم خدا خواہد چنیس

آج بھی اہل ذوق اور محرمان حقیقت اس بلیغ جملہ کا لطف اٹھا سکتے ہیں جن میں مرثیہ کا سوز بھی ہے اور غزل کی لطافت بھی ویسے تو مفتی صاحب کی رفاقت دارالعلوم دیوبند کے جلسہ شوری میں اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی میں حاصل ہوتی رہتی تھی لیکن اصلاً مفتی صاحب کی رفاقت اور وسیع و جامع معنی میں خدمت دین و ملت کے میدان ہیں ہم سفری کی سعادت ۱۹۶۲ء سے حاصل ہوئی۔

جب راولپنڈی، رانچی، جمشید پور کے فسادات نے ملت کا درو رکھنے والوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کو بھٹوڑ کر رکھ دیا اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ اگر

بروقت اس کا مداوا نہ کیا گیا اور مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں، تنظیموں، اور ان کے قائدین رہنماؤں نے ملت ہی کو نہیں بلکہ ملک کو بچانے کے لئے منظم و متحد جدوجہد کا آغاز اور مشترک پلیٹ فارم کو وجود میں لانے کا کام نہ کیا تو اس ملت پر جو کچھ گزرے گی سو گزریگی ملک کی بھی خیریت نہیں، اس تناثر کا سب سے زیادہ غلبہ اور اس صدمہ کی چوٹ سب سے زیادہ (خدا مغفرت کرے اور ان کے درجے بلند کرے) ڈاکٹر سید محمود صاحب کے دل پر تھی، انھوں نے ان سب فکر مند اور درد مند حضرات سے رابطہ قائم کیا جو اس سلسلہ میں ان کے ہم سفر ہو سکتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے دہلی میں ہونے کی وجہ سے ان کا سب سے زیادہ اور پہلا رابطہ مفتی صاحب اور مولوی محمد سلم صاحب ایڈیٹر ”دعوت“ سے رہا، باہر کے لوگوں میں راقم سطور اور مولانا محمد منظور صاحب اس سلسلہ کا پہلا قدم مشاورت کا وہ تالیسی جلسہ تھا جو ۸، ۹، ۱۰ اگست ۱۹۶۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا، اور جس کے نتیجہ میں مسلم مجلس مشاورت وجود میں آئی، اسی جلسہ میں طے پایا کہ ملک کی فضا کو درست کرنے اور احترام انسانیت اور امن آشتی کا پیغام پہنچانے اور بجائے سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے (جن کے ذہن بہت کچھ مسموم ہو چکے ہیں) ملک کی عام آبادی اور ہندو مسلم عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کیا جائے، اس کے ساتھ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے اور ان کو محسوس کرایا جائے، کہ وہ دین حق اور خدا کے آخری پیغام کے حامل انسانیت کے بے لوث خادم و معمار ہونے اور اپنی ان خصوصیات اور دینی ذمہ داریوں کی بنیاد پر اس ملک کے محافظ و پاسبان بھی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلا سفر بہار و اڑیسہ کا ہوا، اور ایک مقرر اور متنوع الافراد وفد نے ستمبر ۱۹۶۴ء میں رانچی، چکر دھری پور، چائے سہ، جھنڈ پور، اور راڈ کیلا کا دورہ کیا۔ ہر جگہ وفد کا شاندار اور پرجوش استقبال ہوا، مقرروں میں ڈاکٹر صاحب

کے بعد مفتی صاحب پیش پیش اور نمایاں ہوتے تھے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں مجلس نے ہمارا سفر کا دورہ کیا، دسمبر ۱۹۴۷ء میں گجرات کا دورہ ہوا۔ جہیں پنڈت سندر لال بھی شریک تھے اس سفر میں پالن پور، احمد آباد، نڈیاڈ، گودھرا، بڑودہ، سورت اور بھڑوچ پر یہ پروگرام اختتام کو پہنچا، گجرات کے دورہ کا ذکر آگیا ہے تو دو واقعات کے تذکرہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ احمد آباد کے قریب ایک مرکزی اور اہم قصبہ میں جس کا نام (اگر حافظہ کوتاہی نہیں کرتا) بیس نگر تھا، میں نے منتظین جلسہ اور رفعت سفر سے درخواست کی کہ چونکہ میں کئی راتوں سے دیر میں سو رہا ہوں اور بہت تھکا ہوا ہوں مجھے تقریر کا پہلے موقعہ دیدیا جائے، ذمہ داروں نے منظور کر لیا، اور پہلی تقریر میری ہوئی میں نے اس تقریر میں ہندوستان کی جغرافیائی وسعت، تاریخی عظمت اور سیاسی اہمیت وغیرہ بیان کرنے کے بعد ایک محب وطن ہندوستانی کی حیثیت سے اس پر حسرت و قلق کا اظہار کیا کہ اتنے عظیم ملک کی قیادت اور انتظام کے لئے ملک کے آزاد ہونے کے بعد جس بالغ سیاسی شعور، وسیع النظری، سیرت و اخلاق کی بلندی اور اصول پسندی کی ضرورت تھی، اسکی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے، شاید جنگ آزادی کی مصروفیت میں قومی سیرت و اخلاق کی تعمیر کا وہ کام نہیں ہو سکا، جس کی اتنے بڑے ملک کے سنبھالنے کیلئے ضرورت تھی، ملک میں ذہنی و اخلاقی انتشار، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور رشوت و کرپشن پھیلنا ہوا ہے، ملک کے بے لوث کارکنوں، سیاسی رہنماؤں، اور قائدین کو اسکی طرف توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ اس آزادی کا برقرار رہنا مشکل ہو جائے گا میں یہ تقریر کر کے اپنی قیام گاہ پر آگیا، واپسی پر ملا جان صاحب نے بتایا (جو تحریک خلافت کے ایک پرانے کارکن اور مجلس مشاورت کے ایک اہم رکن تھے اور کلکتہ میں ان کا قیام تھا) کہ تمہاری تقریر پر پنڈت سندر لال جی نے سخت تنقید اور احتجاج کیا، اور کہا کہ مولانا کو اتنے

تند اور تیز لہجے میں ہندوستان پر تنقید کرنے کا کیا حق تھا؟ انھوں نے ملک کی توہین کی خیریت ہوئی کہ مجمع نے اس پر اپنے غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا، مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ یہ باتیں ایک محب وطن ہندوستانی کے ناتے اور ملک کی خیر خواہی میں خلوص سے کہی گئی تھیں اس پر اتنا برا ماننے کی کیا بات تھی؟ فجر کی نماز کی تیاری کے لئے ہم سب لوگ اٹھے تو دیکھا کہ پنڈت جی اب بھی اس تقریر پر تنقید و تبصرہ کر رہے ہیں، اور مسلمانوں کے بارے میں طنزیہ الفاظ بھی استعمال کر رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مسلمان زمزم کے مقدس پانی مانتے ہیں۔ لیکن گنگا جل کی انکے یہاں کوئی عزت نہیں، وغیرہ وغیرہ میں نے طے کر لیا کہ میں اخیر تک خاموش رہوں گا۔ تاکہ سفر کے مقصد کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اور اس وفد میں جو مختلف الحیال لوگوں پر مشتمل ہے کوئی انتشار نہ پیدا ہو، لیکن حیرت ہوئی کہ رفقاء سفر میں سے جن میں بعض خالص مسلم جماعتوں کے رہنما تھے کوئی ایک لفظ نہیں بولا، اور پنڈت جی کا سلسلہ کلام جاری رہا، اتنے میں مفتی صاحب کی آواز آئی جو ابھی بیدار ہی ہو رہے تھے کہ پنڈت جی آخر مولانا نے کیا بے جا بات کہی آپ اتنے گرم کیوں ہیں؟ اس وقت مجھے مفتی صاحب کی قدر ہوئی کہ انھوں نے نہ صرف دینی حیثیت بلکہ اخلاقی جرأت سے کام لیا، اور میری تائید کی، پنڈت جی اس پر خاموش ہو گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

سفر گجرات کا دوسرا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ بڑودہ میں نماز فجر وغیرہ سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے کہ چند اہل محلہ گھبرائے ہوئے آئے، اور انھوں نے کہا کہ قریب ہی ایک مکان ہے جو زمین میں دھنسیں رہا ہے اس کے آثار نظر آتے ہیں کئی روز سے اس مکان کے مین خواب دیکھ رہے ہیں کہ اس مکان میں نامناسب کام ہوئے ہیں اور انکی

۱۔ اس موقع پر ڈاکٹر سید محمود صاحب صدر مجلس اور مولانا ابواللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی ہند موجود نہ تھے وہ دونوں احمد آباد رہ گئے تھے۔

نخواست سے یہ مکان زمین میں دھنس جائے گا، آپ حضرات چلیں اور وہاں دعا کریں ہم سب لوگ اپنی حقیقت سے واقف تھے ”ایاز قرنخو و راشناس“ لیکن یہ خیال ہوا کہ ملت کے خادموں اور مختلف مسلم جماعتوں کے نمائندوں کی جماعت ہے، اور یہ ایک نیک مقصد سے سفر کر رہے ہیں کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اور یہ بلا ٹل جائے، کچھ نظر پڑتی تھی تو حضرت مفتی صاحب پر کہ عالم، حافظ، فقیہ اور اللہ کے ایک مقبول بندہ اور صاحب نسبت شیخ کے فرزند ہیں، ہم لوگ ہمت کر کے گئے اور وہاں کھڑے ہو کر دعا کی، اور چلے آئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ کیفیت ختم ہو گئی۔ مکان اب بھی اسی حالت میں اس جگہ موجود ہے، محی غلام محمد مین صاحب (جن کا بڑا دورہ میں قیام ہے، اور مفتی صاحب سے خاص تعلق رکھتے ہیں) جب بھی پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ الحمد للہ مکان اپنی جگہ پر قائم اور محفوظ ہے۔ مشاورت کا سب سے بڑا دورہ ریاست میسور میں ہوا، جو ۱۱ نومبر سے شروع ہو کر ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء کو ختم ہوا۔ اسکی مجموعی نشست کا اندازہ ساڑھے چار ہزار میل ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بس سے طے کی گئی۔ بدراں سے شروع ہو کر یہ دورہ گلبرگہ پر ختم ہوا، جھانسی ہی سے راقم السطور کی سفر میں فاق ہو گئی۔ یہ تحریک خلافت کے بعد شوکت اسلامی کا پہلا نظارہ تھا، اس کے اہم مقامات میں بنگلور، مرنگاپٹن (مدن سلطان میو) میسور، مکارہ، منگلور، بانس، بیجا پور، شیموگا وغیرہ تھے۔ اس تاریخی دورہ میں اختتامی تقریر مفتی صاحب کی تھی، انھوں نے فرمایا کہ صحیح آزادی اور جمہوریت وہ ہوتی ہے جس کا فیض یکساں طور پر آبادی کے تمام عناصر اور ملک کے تمام فرقوں اور طبقوں کو پہونچے، اس کی انھوں نے مثالیں دیں، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اس کا ذکر کیا، پھر اپنے پسندیدہ (جگر مورم) کے اشعار پڑھے، جو اس دورہ میں اکثر پڑھا کرتے تھے۔

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ بھی نکھار آئے

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں۔ کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے مفتی صاحب کی تقریروں میں رجائیت اور تعمیری و ابجائی نقطہ نظر غالب ہوتا تھا ان کی تقریریں جذبات میں اشتعال، اور غم و غصہ پیدا کرنے کے بجائے مسائل سلجھانے اور حالات کی طرف سے پُر امید رہنے پر آمادہ کرتی تھیں، اکثر دوسرے مقررین کے مقابلہ میں ان کی تقریریں زیادہ تعمیری اور غیر مسلم سامعین کے لئے جو اکثر مقامات پر بڑی تعداد میں ہوتے تھے (مفتی اور قابل فہم اور قابل قدر ہوتی تھیں) اور ان کو قریب کرنے کا کام کرتی تھیں، جو ان دور کا ایک بڑا مقصد تھا۔

افسوس ہے مجلس کی ان تعمیری سرگرمیوں اور اس کے دوروں کا مفید سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہا، میسور کا دورہ مجلس مشاورت کی شہرت و مقبولیت کا نقطہ عروج تھا، ۶۷ء کے عمومی انتخابات بلا واسطہ مجلس کے لئے اور بلا واسطہ مسلمانان ہند کے لئے ایک نازک ابتلا ثابت ہوئے جماعتوں کے ذمہ داران اور ارکان مجلس نے اپنے اپنے طور پر کچیں کچیں کام کیا اور اس سے مجلس کا شیرازہ جو ابھی تک مرتب و منظم تھا کسی قدر انتشار و تضاد کا شکار ہوا، ۲-۳۔ اپریل ۶۷ء کو مجلس کا جلسہ دہلی میں منعقد ہوا، ڈاکٹر مسید محمود صاحب استعفیٰ پر مصر تھے، لیکن ان کو بڑی مشکل سے اس سے باز رکھا گیا لیکن ان میں اب پہلی سی اُمنگ اور ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس میں ان کی صحت کے روز افزوں انحطاط اور اضمحلال طبع کو بھی دخل تھا، بالآخر انھوں نے ایک جلسہ میں ہم لوگوں کے عرض و معروض کے باوجود صدارت سے استعفیٰ دیدیا، اور بالفاق اقرار مفتی صاحب صدر منتخب ہوئے، جن سے زیادہ اس پر آشوب دور اور اختلاف خیال کی فضا میں کوئی اور شخصیت موزوں نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو دو خاص امتیازی جوہر عطا فرمائے تھے، ایک ذہانت، دوسرے مختلف الخیال افراد اور

جماعتوں، اور بعض اوقات متضاد و متناقض رجحانات میں مصالحت و مفاہمت کی کامیاب کوشش، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مولانا روم کی اس حکیمانہ وصیت پر پورا عمل تھا۔ تو برائے وصل کردن آمدی: نے برائے فصل کردن آمدی

نیز خواجہ حافظ کے اس شعر پر بھی وہ پورے طور پر کاربند تھے۔

آسائشِ دوستی تفسیرِ حق است: بادوستاں تملطف بادشمنان مدارا۔

بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ مختلف نقطہ نظر پوری خطابت اور زور استدلال کے ساتھ سامنے آئے، اور نظر آنے لگا کہ شاید آستینیں چڑھ جائیں۔ کہ مفتی صاحب کے چند فقروں نے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ مختلف جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کی جیسی صلاحیت ان میں دیکھی گئی، کم قائدین میں دیکھنے میں آئی ممکن ہے بعض ”ماہرین نفسیات“ اور ناقدین اس کو ان کی کمزوری اور ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی خوش خلقی و مروت پر محمول کریں، لیکن جب ملت میں انتشار ہو مختلف جماعتیں اور مکاتب خیال کسی نہ کسی درجہ میں عصبیت سے متاثر ہو تو ایسی ”مرجانِ مرج“، ”علم و بردبار اور بے ہمت شخصیت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے، اور آج یہ خلا مفتی صاحب کے انتقال کے بعد نہ صرف مجلس مشاورت کے دائرہ میں (جس کا منصب صدارت ابھی تک خالی ہے) بلکہ ملت کے دائرہ میں بھی محسوس ہوتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اتنا عرض کرتا چلوں کہ مجلس کے طویل و وسیع دوروں میں ہیں دو باتوں کی خاص کوشش کرتا تھا، ایک یہ کہ قیام (علمی، دینی اور طبعی) مناسبت کی وجہ سے، ہمیشہ مفتی صاحب کے ساتھ رہے، دوسرے مناسبتیں (خصوصاً جہزی) انھیں کی امامت اور اقتدا میں پڑھی جائیں، اس لئے کہ مفتی صاحب کی تلاوت میں بڑی حلاوت تھی، وہ بھی رفقا سفر میں مجھ پر خاص طور پر شفقت

فرماتے تھے، اور مانوس و بے تکلف تھے، اسی تعلق و محبت کی بنا پر میری درخواست پر ۱۹۷۸ء میں وہ رائے بریلی تشریف لائے اور واپس جا کر بڑی محبت کا خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے خلوص و مسرت کا اظہار ہوتا ہے۔

مفتی صاحب کی محبت اور تعلق کی بات تھی کہ انھوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ تم اپنی کوئی تصنیف ندوۃ المصنفین کو دو، اور اس کی طرف سے اسکی اشاعت ہو ۱۹۷۸ء کی ابتداء کا کوئی مہینہ تھا، کہ تذکیر گجرات میں محترمی مولانا غلام محمد رضا نورگت کے دولت خانہ پیرجن کا مفتی صاحب سے خاص تعلق تھا، اور میرے بھی بزرگ اور کرم فرماہیں، اس کا ذکر آیا، اور میں نے اپنی کتاب مسیحات عبدالحی عجبوا انھیں دنوں میں مرتب و مکمل ہوئی تھی۔ ندوۃ المصنفین کو پیش کرنے کا وعدہ کیا مفتی صاحب نے اس پر اپنی بڑی خوشی کا اظہار کیا اور بڑی توجہ اور اہتمام کے ساتھ وہ نومبر ۱۹۷۸ء میں ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہو گئی، مجھے بھی مفتی صاحب کی ایک خواہش فرمائش کی تعمیل کی مسرت و سعادت اور کتاب کو ندوۃ المصنفین جیسے موقر تصنیفی ادارہ کی مطبوعات میں شامل ہونے کی عزت حاصل ہوئی، اور وہ الحمد للہ علمی ادبی حلقوں میں پسند کی گئی، مفتی صاحب کی اجازت سے ادارہ نشریات اسلام نار تھ ناظم آباد نے اس کا پاکستانی ایڈیشن بھی شائع کیا۔

مفتی صاحب اخیر میں چند شدید بیماریوں کا شکار رہے، لیکن مزاج میں جو مروت اور لینت، پُرانے تعلقات کا پاس و لحاظ اور اخلاق و ایثار کا جو جوہر تھا وہ ضروری آرام و احتیاط میں بھی غفل ہو جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے بہت سے قدیم عارض اور جدید تکلیفوں کے باوجود دار المصنفین کے اس سمینار میں شرکت ضروری سمجھی جو اسلام اور مشرقین کے عنوان پر ۲۶ - ۲۸ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ ۲۱ - ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو دار المصنفین کی طرف سے اس کے زیر اہتمام

شبلی نیشنل پوسٹ گزٹ بحیثیت کالج اعظم گڑھ میں منعقد ہوا، اسی سفر سے واپسی پر دریا آباد کے اسٹیشن پر ان پر اچانک فوج کا حملہ ہوا، یہ انتظام غیبی تھا کہ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور چند غلص احباب و رفقا خاص ہمسفر تھے، لکھنؤ کے طبی امداد کے اسٹیشن پر پہنچ جانے کی اطلاع کر دی گئی، وہاں مفتی صاحب کو اتار لیا گیا، مفتی صاحب کے نیاز مندوں اور ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے احباب و خدام نے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس کیا، اور حصول سعادت اور خدمت کو غنیمت سمجھا، راقم سطور بھی لکھنؤ میں موجود تھا، وہ بھی اس سعادت میں شریک رہا، مفتی صاحب کو بلرام پور ہسپتال میں داخل کر دیا گیا، دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ نے دین و ملت کے اس ”ہما“ کی پذیرائی میں کوتاہی نہیں کی، جو قسمت سے اڑ کر ان کے پاس پہنچ گیا تھا، خیال تھا کہ جب تک آرام نہ ہو جائے مفتی صاحب یہاں سے تشریف نہ لے جائیں، لیکن گھروالوں کا تقاضہ غالب آیا اور یہ خیال ہوا کہ ان کا حق زیادہ ہے اور شاید وہاں مفتی صاحب کو قلبی و روحانی سکون اور طمانینت ملے اس لئے بادل ناخواستہ یہ جدائی گوارا کی گئی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی وہ سعادت مقرر آگئی، جس کے متعلق فرما دیا گیا ہے کہ

لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ

اور نہ صرف ندوۃ المصنفین بلکہ وہ سب دینی ادارے جس کے وہ رکن و مشیر اور معاون و رفیق تھے، نہ صرف دہلی جوان کا مسکن اور دیوبند جوان کا وطن تھا، بلکہ برصغیر ہند (ہندوستان و پاکستان) ان کی رہنمائی، احسانیت رائے سلامت فہم اور مختلف انجیال لوگوں میں وصل و جمع کی صلاحیت سے محروم ہو گیا، رحمۃ اللہ رحمۃ واسعة

مفتی صاحب کے لئے تقدیر الہی میرے لئے توفیق و سعادت کی بات

تھی کہ مفتی صاحب کی وفات کا واقعہ پیش آیا تو میں حجاز مقدس میں تھا، مجھے دہلی کے ٹیلیفون سے اس کی بروقت اطلاع ملی، میں نے اسی وقت سعودی ریڈیو اسٹیشن سے رابطہ پیدا کیا اور عزیز مولوی نصار رفیع ندوی انچارج شعبہ اردو جدہ ریڈیو اسٹیشن کو اپنی قیام گاہ پر بلا کر مفتی صاحب کے حادثہ ارتحال اور ان کی شخصیت، خدمات و کمالات پر ٹاک ریکارڈ کرائی، جو اسی دن نشر ہوئی اور اسی کے ذریعہ حجاز مقدس اور سعودی عرب کے دوستوں اور اہل تعلق کو حادثہ کا علم ہوا مجھ سے جو کچھ بن آیا۔ مفتی صاحب کے رفیع درجات کے لئے دُعا اور طواف کی سعادت حاصل کی اور اپنے غلص احباب کو بھی اس کی ترغیب دی۔ اندازہ ہے کہ بہت سے غلصین نے یہ سعادت حاصل کی، اور مفتی صاحب کے لئے دُعا و طواف کے ذریعہ ایک جلیل القدر عالم اور خادم ملت کے لئے دعا اور ایصال ثواب کر کے اپنے لئے بھی قبولیت اور ترقی دینی کا سامان کیا، شاید کم مشاہیر و زعماء کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو، کہ اس قدر جلد ان کے لئے دیار مقدس میں دُعا کے مغفرت اور ایصال ثواب کا اہتمام ہوا ہو۔

وَذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ — — —

